اقبال سے نیا مکالمہ براستہ بانگِ درا

شاہدہ رسول

صائمہ عباس

Abstract:

The ever-changing circumstances of life demand that Allama Muhammad Iqbal's claim that his poetry is an interpretation of the Quran and Sunnah be re-examined. Since the publication of his first poetic collection, Bang-e-Dara, until now, so much has been written about his philosophy that some critics say there's nothing left to explore. We believe that the existing critiques should be re-evaluated.With this aim, we revisited our notes on Bang-e-Dara on its centennial anniversary. These writings helped us understand how Iqbal's ideas had once filled us with conviction and confidence, but also led to doubts and uncertainty at times.If we had been convinced that Iqbal's poetry possessed universality, we could have spent the rest of our lives with that conviction. However, as we delved deeper into research, we were faced with an endless array of questions. It was then that we decided to engage in a direct dialogue with Iqbal through Bang-e-Dara.Due to the vastness of the topics covered in this poetic collection, it was impossible to discuss them all in this brief article. Therefore, we selected a few poems and ghazals to ask Iqbal how he can guide us in the modern era. We also asked if new events could diminish his impact. This article attempts to find answers to these questions and more.

حکیم الامت علامہ محمد اقبال کے فکر و نظر کی تفہیم کا سلسلہ ان کی زندگی میں شروع ہوا اور ۲۰۲۴ء تک صورتحال یہ ہے کہ ان کے فکر و فلسفے کو عہد جدید کے لیے ناکارہ قرار دینے پر اصرار ہونے لگا ہے۔کوئی بھی بڑا شاعر،ادیب یا مفکر کسی کی مرضی کے تابع ہوتا ہے اور نہ ہی امتداد زمانہ سے مٹ سکتا ہے۔سو علامہ اقبال

کے فکر و فلسفے کو معدوم کرنے کی ہر کوشش اقبال کو نئی بلندیوں سے آشنا کرتی رہی۔ بیسویں صدی کے اختتام تک صورتحال یہ رہی کہ جب کبھی اقبال کے کسی نظریئے پر تنقید ہوئی تو بعض صاحب بصیرت اقبال شناسوں نے عمیق نظری سے اقبال کے ان تصورات کا مطالعہ کیا جنھیں ان کے مخالفین نے حدف تنقید بنایا تھا۔ نتیجتاً فکر اقبال سے وہ جہان معنی تشکیل پا تا رہا جسے اقبال پر ہونے والی تنقید سے قبل ماہرین اقبال نے بھی نظر انداز کیا تھا جدید دور میں اقبال کے طالب علم کو اس امر میں بھی الجھایا گیا کہ تفہیم اقبال بے اعتدالی کا شکار رہی ہے۔ اقبال شناسوں کا ایک طبقہ انھیں ولی ثابت کرنے پر مصر ہے تو دوسرا ان کی ذات اور افکار و خیالات میں عیب جوئی اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے۔ راقمہ نے اقبال کو انہی دو انتہاؤں کے درمیان رہتے ہوئے دریافت کیا۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم براہِ راست تخلیق کار سے مکالمہ بہت کم کرتے ہیں اس لیے مانگے کی روشنی سے جلنے والے چراغ اس وقت تک روشن رہتے ہیں جب تک کوئی اور رنگ اسے معدوم نہ کر دے۔ تخلیق کار سے مکالمہ جہاں اس کی بصیرت قاری پر عیاں کرتا ہے وہاں خود اس کے اپنے ذہن کا افق بھی روشن ہوتا ہے اور یہ روشنی فطری رنگوں سے مزین ہونے کے سبب کبھی ماند نہیں پڑتی بلکہ روز افزوں ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کے افکار اب اس امر کے متقاضی ہیں کہ انھیں ناقدین اقبال کی نظر سے دیکھنے کی بجائے جدید دور کے تقاضوں کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے ان سے از سرِ نو مکالمہ کیا جائے۔ یہ طرزِ عمل علامہ اقبال کے ۱۹۲۴ء میں منظرِ عام پر آنے والے ان کے شعری مجموعے بانگِ درا کو ۲۰۲۴ء میں نئی معنویت کے ساتھ ہم سے متعارف کروائے گا۔

علامہ اقبال اپنے کلام کے بارے میں خود یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کلام قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کے سوا کچھ نہیں۔ ناقدین اقبال ان کی اپنی ہی تعبیر کے نتیجے میں دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک وہ طبقہ جس نے یہ تسلیم کر لیا کہ اقبال نے شاعری کے ذریعے قرآن اور حدیث کی شرح لکھی ہے۔ دوسرا گروہ ان ناقدین کا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال کا کلام ان کے فکری تضاد کا منہ بولتا ثبوت ہے اگر وہ اپنے کلام کو قرآن و حدیث کی تشریح سمجھتے ہیں تو یہ اعتراف بھی ان کے قلم سے نکلا ہے کہ ان کی ساری زندگی مغربی لٹریچر کے مطالعے میں صرف ہوئی ہے۔ اس گروہ کے نزدیک یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر اقبال کی فکر میں تضادات کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ہماری دانست میں درست نتائج کے تعین کے لیے یہ دونوں گروہ اس وقت تک ہماری سمت نمائی نہیں کر سکتے جب تک جدید دور کے تقاضوں کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے اقبال سے از سرِ نو مکالمہ نہ کیا جائے۔ بحثیت محقق ہم کئی سوالات کی روشنی میں بانگِ درا کے ذریعے اقبال سے مکالمہ کر کے اس حقیقت کو

سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ اقبال کو معدومیت کا خطرہ ہے؟ اگر ہے تو کیا آج کا جدید ذہن ہی ان اسرار و رموز تک جا پہنچا ہے جو اقبال کے مذکورہ بالا دعوے کی تردید کرتے ہیں۔

اس مقالے میں بانگِ درا کے جدید مطالعات سے یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے گی کہ مسلمانوں کا اقبال سے انحراف بین الاقوامی سطح پر اس سے خوفزدگی کا نتیجہ ہے یا جدید دور میں اردو زبان کے غیر اہم ہونے کے نتیجے میں کلامِ اقبال موثر نہیں رہا۔ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ فکرِ اقبال کے وہ کون سے گوشے ہیں جن میں دورِ جدید کے مسلمانوں کے لیے بالعموم اور نوجوانانِ اسلام کے لیے بالخصوص فکر و عمل کی نئی راہیں نکل سکتی ہیں۔

بانگِ درا کا جدید تناظر میں مطالعہ کرنے کے لیے سب سے پہلے ہم اسی سوال پر غور کرتے ہیں کہ اقبال کو معدومیت کا خطرہ ہے یا اس دور کے "تحرک پذیر" جمود کو توڑنے کا واحد راستہ فکرِ اقبال سے نکلتا ہے۔ اقبال کے مخالفین ان پر سب سے بڑا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ بانگِ درا کی نظموں کے مطالعے سے ہی ان کی فکر اور شخصیت کے تضادات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ بطور محقق ان تضادات کی حقیقت کو سمجھنے کی ایک طالب علمانہ کوشش اس مقالے کا بنیادی مقصد ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ صراحت ضروری ہے کہ حضرت علامہ نے اردو کے پہلے شعری مجموعے بانگِ درا کو تین حصوں میں منقسم نہیں کیا بلکہ یہ تین ادوار ہیں جن میں ان کی فکر نمو پذیر رہی۔ بانگِ درا کا پہلا حصہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک کی نظموں اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ ناقدینِ اقبال اس حصے میں شامل کلامِ اقبال کو فنی اعتبار سے وہ مقام تفویض نہیں کرتے جو بانگِ درا کے آئندہ دو ادوار سے لیکر ارمغانِ حجاز تک ان کے کلام کا خاصہ ہے، مگر ہماری دانست میں اقبال نے اپنی بلندیٔ فکر کا اظہار اسی ابتدائی دور میں کر دیا تھا۔ ان کی ابتدائی دور کی نظمیں آج کے جدید انسان سے مکالمہ کرتے ہوئے بھی یہی جواب فراہم کرتی ہیں کہ اللہ کی طلب اور جستجو کا اولین راستہ فطرت سے محبت کے نتیجے میں کھلتا ہے۔ بانگِ درا کی پہلی نظم "ہمالہ" کو نظریاتی جکڑ بندیوں سے علیحدہ ہو کر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ جس زمانے میں وہ نظم تخلیق کی گئی وہ دور پاک و ہند کی علیحدگی کے تصور ہی سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ اس سیاق و سباق میں پہاڑ کی بلندی سے انسانی فطرت کو ہم آمیز کرنے اور ہمالہ کے حسن و دلکشی کی نغمہ خوانی اقبال کو ایک خاص سمت کا مسافر ظاہر کر رہی تھی۔

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو، دیوارِ ہندوستاں ہے تو

مطلعِ اول فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہر عالم تاب پر(۱)

اس نظم میں ہندوستان سے خطاب اقبال کے کسی ایسے نظریئے کا نقیب نہیں ہے جس میں انہیں وطنیت کے بت کا پجاری کہا جا سکے البتہ "ترانہ ءہندی" میں ان کی وطن پرستی کسی قدر نمایاں ہے۔اقبال کے ذہنی ارتقا کا مطالعہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وطنیت کے اس بت کو خود حضرت علامہ نے عمیق مطالعے اور گہرے غور وفکر کے بعد پاش پاش کر دیا تھا سو اگر پہلے دور میں شامل ترانہ ءہندی میں وہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا راگ الاپ رہے ہیں تو دوسرے دور میں وطنیت کے عنوان سے ایک نظم میں وطن کو خود ہی بت قرار دے کر اس کے پیرہن کو ملت کا کفن کہہ کر اپنی فکر کے ارتقا کی دلیل فراہم کر دیتے ہیں۔اس حوالے سے بحث ونقد ہمارا موضوع نہیں سو اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہ صراحت مقصود ہے کہ فطرت سے خدا کی محبت تک کا سفر اس امر کا غماز ہے کہ اقبال جویائے اسرار ورموز تھے۔وہ اپنی سوچ اور فکر کو کسی ایک نقطے پر مرکوز رکھنے کی بجائے لحظہ بہ لحظہ رونما ہونے والی تبدیلیوں سے خود کو ہم آہنگ کرنا زیادہ بہتر سمجھتے تھے، مگر اقبال کے بعض نقطہ چیں اس حقیقت کو نہ سمجھے یا دانستہ اس سے گریز کر کے اقبال کے فکری تضاد کو نمایاں کرنے میں سرگرمِ عمل رہے۔فطرت سے خدا کی محبت کا سفر وہ پہلا زینہ تھا جسے طے کر کے اقبال کو بلندیوں کا مسافر ہونا تھا,لیکن یہ مرحلہ بھی آسان نہ تھا فطرت سے محبت براہِ راست خدا تک پہنچنے کا وسیلہ نہیں تھی۔اقبال نے کسی عارف کے اس قول کے مطابق خود کو پہچاننے کی کوشش کی ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' ترجمہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا تحقیق اس نے اپنے رب کر پہچان لیا۔

اس ضمن میں اقبال کی پہلے دور کی منظومات میں ''زہد اور رندی'' کے عنوان سے ایک خوبصورت تمثیل موجود ہے۔اس نظم پر ہمارے نقادوں نے اپنے اپنے انداز میں جو خامہ فرسائی کی ہے۔اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس کے کچھ اشعار یہاں درج کر کے از سرِ نو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقبال کے قلب وذہن میں کیسا محشر بپا تھا۔

مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال کہ ہے قمریِ شمشاد معانی
پابندیِ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سنی اس کی زبانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عاراسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعراء کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھُلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی(۲)

محولہ بالا اشعار میں اقبال نے ان تمام اعتراضات کو نمایاں کیا ہے جو ان کی شخصیت اور شاعری پر اب تک وارد ہوتے ہیں ہمارے نقادوں نے ان اشعار کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال فلسفیانہ اثر کی وجہ سے مذہب کے حوالے سے کوئی واضح نقطہ ء نظر اختیار نہیں کر سکے وہ رقص و سرود کی محفلوں میں جانا معیوب نہیں سمجھتے، مگر قرآن کی تلاوت بھی ان کا معمول ہے اقبال کی حسن فروشوں سے محبت یا بالفاظِ دیگر انہیں بازار حسن کا خریدار ثابت کرنے کے لیے ناقدین عام طور پر اقبال کی اسی نظم کا حوالہ دے کر ان کے نئے

قاری کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقبال کے کردار پر کئی سوالیہ نشان موجود ہیں جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں گانا سننا اور کسی بڑے گناہ کا ارتکاب دونوں الگ الگ معاملات ہیں، مگر اقبال کے فکری تضاد ہی کو نمایاں کرنے کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنی جوانی کو مانندِ سحر قرار دینا دراصل خود کو کسی اوٹ میں چھپالینا ہے۔ ہم نے اس نظم کے تجزیئے کے لیے بغیر کسی حوالے کے ان تحریرات کو یہاں پیش کرنے کی جسارت کی ہے جو ہمارے ذہن کی خالی سلیٹ پر زمانہء طالب علمی میں ثبت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اقبال کی اسی نظم کا جب زاہد اور رند کے درمیان چپقلش کی مخصوص روایت کے تناظر میں مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اقبال بے تحقیق ملا کا ویسا ہی مخالف ہے جیسا آج کے دور میں کوئی بھی جدید ذہن ہو سکتا ہے۔ پھر اس نظم کی تخلیق کا محرک وہ تناظر بھی ہو سکتا ہے جس کی جکڑبندیوں میں ہم صدیوں سے اسیر ہیں۔ اقبال زہد اور رند کے دو کرداروں کے ذریعے اس عجلت پسندی کو نمایاں کرنے کی کوشش کر رہے تھے جس کے نتیجے میں بغیر سوچے سمجھے کسی کے کردار کو مشکوک بنا دیا جاتا ہے۔ یہی وہ تناظر ہے جس نے برس ہا برس سے ہمیں تحقیق کی روش سے دور کر دیا ہے۔ اس کا شکوہ علامہ اقبال بال جبریل میں شامل غزل کے ایک شعر میں یوں کرتے ہیں

شیر مردوں سے ہوا بیشہءِ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و مُلا کے غلام اے ساقی(۳)

بالعموم ناقدین اس نظم کو تین حصوں میں منقسم کرتے ہیں، مگر ہماری دانست میں اس کے دو ہی حصے ہیں۔ نظم کے دوسرے حصے میں جہاں رند کی زاہد سے ملاقات ہو جاتی ہے اس کی بعض شارحین یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ اقبال نے ان مولوی صاحب کو جب اسی کوچے میں دیکھ لیا تو مولوی صاحب کو ان سے معذرت کرتے ہی بنی، مگر اقبال کی نظم کے اس حصے کا مطالعہ کرتے ہوئے احساس ہوا کہ جویائے اسرار حق حضرت علامہ محمد اقبال نے اپنی تخلیق، ابتدا اور انتہا پر غور و فکر کی عادت کو ایک تمثیلی پیرائے میں بیان کر کے ہر شخص کو راغب کیا ہے کہ اپنی ہستی سے متعلق ابتدائی نوعیت کے سوال اگر وہ خدا سے پوچھے تو کبھی نہ کبھی اپنی پہچان کا سفر ضرور طے ہو سکتا ہے۔ تمثیل ملاحظہ ہو

اک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی

فرمایا، شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا زرہِ قربِ مکانی
خم ہے سر تسلیم مرا آپ کے آگے
پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ 'اقبال' کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے(۴)

آگہی کا یہ سفر بانگِ درا کے پہلے دور کی نظموں اور غزلیات میں ہر چیز کو اس کی انتہا پر دیکھنے کا متمنی نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدہءِ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں(۵)

مگر جب عشق کا یہی جذبہ ارتقا کی منزل طے کرتا ہے تو یہی اقبال لذت و سرور سے مغلوب ہو کر کہتا ہے

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے(۶)

غور کیجئے کہ اقبال کے کلام کے مختلف ادوار کا مطالعہ اگر ہمیں شاعر مشرق کے نئے ذہنی افق سے آشنا کرتا ہے تو یہ فکری تضاد کیوں کر ہو سکتا ہے. ایسے موضوعات جہاں اقبال نے فطرت سے اپنی ذات اور خدا کی ہستی تک رسائی کا سفر طے کیا ہمیں بیک وقت اقبال کے عہد طفولیت سے بھی آشنا کرتے ہیں اور اس امر کے غمازی بھی کہ فکر اقبال اپنے اولین دور میں ہی ایک متعین منزل کی طرف گامزن ہو گئی تھی. اقبال نے بانگِ درا کے تیسرے حصے میں شامل نظم "شمع اور شاعر" میں وہ فلسفہ حیات پیش کر دیا جو اقبال کی شاعری کا مرکز و محور ہے۔ ہماری مراد فلسفہ خودی سے ہے۔ اقبال خود شناسی کی لذتوں سے بہرہ ور ہوئے تو اس انفرادی کیف و سرور میں پوری ملتِ اسلامیہ کو شریک کرنا اپنا فرضِ منصبی جانا۔ صدیوں سے غلامی میں مبتلا قوم کو احساس دلایا کہ اپنے اندر چھپے ہوئے انگنت امکانات مسلمانوں کے لیے بالعموم اور نوجوانان اسلام کے لیے بالخصوص تسخیرِ کائنات کی راہ ہموار کر سکتے ہیں اشعار دیکھیے۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے، لیکن مثالِ بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے(۷)

زہد اور رند والی نظم میں اقبال نے اپنی تلاش کے جس سفر کا آغاز کیا تھا وہ آخری دور کی دو نظموں "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" کے ابتدائی بند میں یقین اور اعتماد کی وہ زبردست قوت بن کر ابھرتا ہے جس سے محض اقبال کو سروکار نہیں بلکہ ہر اس شخص کے لیے ان دونوں نظموں کے ابتدائی بند خود شناسی سے خداشناسی تک پہنچنے کی نوید بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔ شکوہ کا پہلا بند ملاحظہ کیجئے

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرآت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو(۸)

خود شناسی کے سفر میں اقبال کے اندر وہ جرآت اور اعتماد پیدا ہوا ہے جس نے انہیں اندر سے جھنجھوڑ کر یہ آگہی فراہم کی ہے کہ وہ کائنات یا دنیا جسے انسان کے لیے مسخر کیا گیا ہے اس کائنات کے ایک باشندے کی حیثیت سے وہ ایسی تجارت کیوں کرے جس میں نقصان اس کے حصے میں آئے اور سود فراموشی کا ارتکاب کر کے وہ اپنے انسان ہونے پر ہی شرمندہ ہو جائے۔ ماضی کے غم میں مبتلا رہ کر اپنی صلاحیتوں کو تباہ کرنے کی بجائے اسی آئینے میں مستقبل کو دیکھنا اور اس کے لیے فکر مند ہونا عین فطرت انسانی ہے اللہ کا عاشق عقل سلیم کا حامل انسان ہے۔ اس لیے اقبال خود کو گل و بلبل کے فسانوں سے آزاد کر کے جب اللہ سے شکوہ کرنے کی جسارت کرتے ہیں تو یہ اسلوب اقبال کے جدید قاری کو بھی کسی نوع کی گستاخی کا درس نہیں دیتا بلکہ جرآت اور اعتماد کی وہ راہیں سجھاتا ہے جن کی منزل دنیاوی واخروی کامیابی ہے اور اس منزل پر کامیابی سے پہنچنے والا انسان عالم ایجاد میں صاحب ایجاد قرار پاتا ہے۔ "شکوہ" کے عنوان سے طویل نظم پر بحث و نقد کا یہ مقام نہیں اس کا پہلا ہی بند ،بندوں کو اللہ سے ہمکلام ہونے کے جس نئے سلیقے سے آشنا کرتا ہے اس کی وضاحت خود علامہ اقبال نے "جواب شکوہ" میں کر دی ہے۔

آئی آواز، غم انگیز ہے افسانہ ترا
اشکِ بے تاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرہِ مستانہ ترا
کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے(۹)

اقبال نے اللہ سے مکالمہ کی جو نئی طرح بال جبریل کی غزل میں یہ کہہ کر ڈالی

اثر کرے نہ کرے سن تو لے میری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد(۱۰)

اس کا آغاز بانگِ درا کی انہی دو منظومات سے ہو گیا تھا۔ یہ منظومات اس مخصوص زمانے کی ترجمان ہر گز نہیں جس میں اقبال سانس لے رہے تھے بلکہ آج کا سنجیدہ قاری اگر اقبال سے براہِ راست مکالمہ کر کے جرآت اور اعتماد کا درس لینا چاہتا ہے تو بانگِ درا کی یہی دو منظومات وہ کلید فراہم کرتی ہیں جس سے فکر و ذہن پر موجود بڑے سے بڑا قفل بآسانی کھولا جا سکتا ہے۔

بانگِ درا کے پہلے حصے میں ایک بڑی تعداد ان منظومات کی ہے جو انگریزی ادب سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ ان منظومات کے ذریعے نونہالان چمن کی جس انداز سے کردار سازی کا فریضہ سر انجام دیا گیا ہے آج کے بلند و بانگ دعوے کرنے والا کوئی مفکر اس کا عشر عشیر بھی نہیں کر سکا۔

ان تصریحات کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اقبال کی فکر ایک عالمگیر فلسفے سے نمو پذیر ہوئی اس لیے اسے معدومیت کا خطرہ ان معنوں میں ضرور ہے کہ انسان اپنی بقا کی فکر سے آزاد ہو کر اقبال سے ناطہ توڑ لے ورنہ افکارِ اقبال میں اتنی وسعت اور ہمہ گیریت ہے کہ اسے ہر دور کے تقاضوں کے مطابق جس قدر چاہیں نئے معانی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ بانگِ درا کے کسی نئے موضوع پر بحث و نقد سے پہلے اس شعری مجموعے کو ناقدین اقبال کے آئینے میں سرسری طور پر دیکھ لیتے ہیں۔ یوسف حسین چشتی اس شعری مجموعے کے حوالے سے لکھتے ہیں

> ”بانگِ درا علامہ اقبال مرحوم کی سب سے زیادہ مشہور کتاب بلکہ ان کی شہرت کا سنگِ بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام میں اسی کی بدولت انہیں لازوال شہرت حاصل ہوئی جس میں دوسری کتابوں کی وجہ سے اضافہ ہوتا رہا۔“(۱۱)

غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

> ”بانگِ درا کو آج بھی اقبال کی تصانیف میں مختلف وجوہ سے امتیاز کا ایک خاص درجہ حاصل ہے“(۱۲)

یوسف سلیم چشتی اور غلام رسول مہر کی بانگِ درا کے حوالے سے آراء کو ایک تسلسل سے بیان کرنے کا مقصد اس امر کا ثبوت فراہم کرنا ہے کہ اقبال سے براہِ راست مکالمہ بہت کم یہ گنجائش پیدا کرتا ہے کہ اس کی تفہیم کے لیے کسی نقاد کی رائے کا سہارا لیا جائے یہ دونوں آراء ہمارے اس مفروضے کی تائید کرتی ہیں کہ بانگِ درا اقبال کا ایک علمی شاہکار ہے بقول صلاح الدین احمد

> "اقبال قدرت سے ایک دانائے راز، ایک مفکر اور ایک عارف کا مقدر لے کر آئے تھے"(۱۳)

اب رہا یہ سوال کہ آج کا جدید ذہن اس فکری تضاد کو پہچاننے کے قابل ہو چکا ہے جس کی طرف راغب کرنے کی کوشش ہمارے نقادوں کی طرف سے برس ہا برس سے کی جا رہی ہے تو اس کا سادہ سا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ معاصر عہد میں اقبال کو ناقدین کی طرف سے قائم کردہ آراء سے کوئی خطرہ نہیں۔ جدید ذہن ان معنوں میں جدید نہیں ہوا کہ وہ اقبال کے اس قول کی تفسیر بن سکے۔

> "فلسفیانہ غور و فکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں۔ جیسے جیسے جہان علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے لیے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں کتنے ہی اور، اور شاید ان نظریوں سے جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں زیادہ بہتر نظریئے ہمارے سامنے آتے جائیں گے" (۱۴)

اگرچہ اقبال کے یہ خیالات ان خطبات کے حوالے سے تھے جو مدراس اور علی گڑھ میں پیش کیے گئے تاہم ان کا یہ قول تمام تر فکر اقبال پر منطبق ہوتا ہے ہمیں صدیوں کی طویل بین الاقوامی ریاضت کے بعد اجتماعی یادداشت سے محروم کر دیا گیا ایسی صورت میں ہمارا جدید ذہن اقبال ہی نہیں مذہب اور زبان اُردو کو بھی ایک غیر ضروری چیز سمجھ کر رد کر دینے پر مصر ہے۔ ایسی صورت میں وہ اقبال کے کسی دعوے کی تائید یا تردید کرنے کے قابل نہیں رہتا جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ اقبال کے پیغام کا عام ہونا بین الاقوامی سطح پر کیوں ایک سوالیہ نشان ہے تو اس کا جواب بھی یہ دیا جا سکتا ہے کہ اقبال کا ہمہ گیر فکر و فلسفہ حرف حرف صداقت ہونے کی وجہ سے دلوں پر اثر انداز ہو کر اس کے اس شعر کی سند فراہم کرتا ہے

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے(۱۵)

سو کلامِ اقبال کو نصاب سے خارج کرنے یا ان کے فکر و فلسفے سے قوم کو بد ظن کرنے کے لیے ان دیکھی قوتیں ایک ایجنڈا تیار کرتی ہیں جس کے مطابق محبوب تابش جیسے نام نہاد اقبال شناس ان کے کلام میں سرقہ تلاش کر کے قوم کو گمراہ کرنے کے فرائض پر مامور ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''اقبال خوش گمانیاں، غلط بیانیاں'' میں بانگِ درا کے ایک شعر کو ذوق کے شعر کا چربہ بتاتے ہیں ذوق اور شکوہ میں موجود دونوں اشعار دیکھئیے جو محبوب تابش نے پیش کیئے ہیں۔ محبوب تابش کے مطابق اقبال کا یہ شعر

آئے عشاق گئے وعدہء فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

ذوق کے اس شعر کا چربہ ہے

مجھ سا مشتاقِ جمال ایک نہ پاؤ گے کہیں
گرچہ ڈھونڈو گے چراغِ رخِ زیبا لے کر(۱۶)

[

دونوں اشعار میں ''رخِ زیبا'' کی ترکیب کے علاوہ کوئی بات مشترک نہیں اگر اس طرح کے اخذ و استفادہ پر شعراء اور ادباء کو جعلساز قرار دیا جاتا رہا تو تقریباً سارا ادب ہمیں ردی کی ٹوکری میں ڈالنا ہو گا ہماری دانست میں اقبال کو معدوم کرنے یا نوجوان نسل کو ان کے اثر سے دور رکھنے کے لیے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایسی کتابیں لکھوائی جاتی ہیں تا کہ ہم اپنے مشاہیر سے بدگمان ہو کر ان اقدار اور روایات کی طرف پلٹ کر نہ دیکھیں جو ہمارا عظیم سرمایہ ہیں اور اقبال جیسے مفکر کا مطالعہ اگر ہمیں وہ جرآت اور اعتماد عطا کر دے جو ہمارے آباء کی میراث ہے تو عالم ایجاد میں ہمارے صاحب ایجاد ہونے اور دنیا پر حکمران ہونے میں کوئی امر معنٰی نہ رہے گا۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر بین الاقوامی سطح پر اقبال کو ہم سے دور رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اقبال کی نظموں کا تمثیلی رنگ ان کے پہلے شعری مجموعے بانگِ درا ہی سے نمایاں ہے اور کلامِ اقبال کی یہ وہ خوبی ہے جو اس جدید دور میں نونہالان چمن کے فکر و ذہن کی براہِ راست آبیاری کر سکتی ہے۔ حضرت علامہ نے بچوں کے لیے بانگِ درا میں جو نظمیں ترجمہ کی ہیں ان پر طبع زاد تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔ معاصر عہد میں بانگِ درا ہی میں شامل کئی نظمیں بچوں، جوانوں اور بزرگوں کی فکری بالیدگی میں معاون ہو سکتی ہیں۔ ان نظموں

کے ڈرامائی یا تمثیلی رنگ سے فائدہ اٹھا کر ان کی نئی جدتوں کے ساتھ پیشکش نسلِ نو سے علامہ اقبال کا ایک نیا تعارف ثابت ہو گا۔

حوالہ جات:

۱۔ علامہ محمد اقبال، ''نظمِ ہمالہ''، کلیاتِ اقبال اردو، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء)، ص ۵۱۔

۲۔ علامہ محمد اقبال، ''نظم زہد اور رندی''، کلیاتِ اقبال اردو، ص ۹۱۔

۳۔ علامہ محمد اقبال، بالِ جبریل، مشمولہ: کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۵۱۔

۴۔ علامہ محمد اقبال، ''نظم زہد اور رندی''، کلیاتِ اقبال اردو، ص ۹۲۔

۵۔ علامہ محمد اقبال، بانگِ درا، مشمولہ: کلیاتِ اقبال اردو، ص ۱۳۱۔

۶۔ علامہ محمد اقبال، ضربِ کلیم، مشمولہ: کلیاتِ اقبال اردو، ص ۶۳۹۔

۷۔ علامہ محمد اقبال، ''نظم شمع اور شاعر''، کلیاتِ اقبال اردو، ص ۲۲۰۔

۸۔ علامہ محمد اقبال، ''نظم شکوہ''، کلیاتِ اقبال اردو، ص ۱۹۰۔

۹۔ علامہ محمد اقبال، ''نظم جوابِ شکوہ''، کلیاتِ اقبال اردو، ص ۲۲۸۔

۱۰۔ علامہ محمد اقبال، بالِ جبریل، مشمولہ: کلیاتِ اقبال اردو، ص ۳۴۸۔

۱۱۔ یوسف حسین چشتی، بانگِ درا مع شرح، (دہلی: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۴۔

۱۲۔ غلام رسول مہر، شرح مطالبِ بانگِ درا، (دہلی: چمن بک ڈپو اردو بازار، س۔ن)، ص ۴۔

۱۳۔ صلاح الدین احمد، تصوّراتِ اقبال، (دہلی: کوہِ نور پریس، ۱۹۷۴ء)، ص ۱۱۔

۱۴۔ علامہ محمد اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، مترجم: نذیر نیازی، (نئی دہلی: اسلامک بکس سنٹر، ۱۹۹۲ء)، ص ۴۰۔

۱۵۔ علامہ محمد اقبال، ''نظم جوابِ شکوہ''، کلیاتِ اقبال اردو، ص ۲۲۷۔

۱۶۔ محبوب تابش، اقبال: خوش گمانیاں، غلط بیانیاں، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۳۔